محمد صفدر میر کی شعری علامتیں

سمیرا مختار

Abstract :

Muhammad Safdar Meer was famous Urdu poet of the 20th centaury. This article seeks to bring into light the symbols of Muhamamd Safdar Meer's poem that he created in his poetry. The critic has tried to open hidden meaning of symbols discovered by the poet during creative act. This article deals with the styles and techniques he had employed in his symbolic poetry.

محمد صفدر میر عہد جدید کے ایک اہم شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں تنہائی اور نارسائی کا کرب ملتا ہے۔ اقدار کی توڑ پھوڑ اور تضادات کے نتیجے میں تنہائی کا شدید احساس ان کی شاعری میں اجاگر ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے یہ جذبہ کبھی نہ ختم ہونے والا ہے۔ تنہائی ہی کی بدولت ان کی نظموں میں اداسی کا عنصر غالب ہے۔ موضوعاتی حوالے سے ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے، اگرچہ وہ اس ایک بڑے موضوع یعنی تنہائی و اجنبیت کے گرد گھومتا ہے۔ علامت نگاری کے سلسلے میں وہ ذاتی علامات بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں رومانویت کے اثرات بھی ملتے ہیں جن کے تحت وہ کائنات کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی خواہش رکھتے ہیں مگر رومانوی احساسات میں انفرادیت ہے اور یہ اختر شیرانی کی روایتی رومانویت سے یکسر مختلف ہے۔ ان کے ہاں رومانوی کرب فرد اور معاشرے کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ صفدر میر نے شعری اسلوب کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ انھوں نے مروجہ شاعرانہ روایت سے الگ اور منفرد انداز اختیار کیا ہے۔ فیض احمد فیض، صفدر میر کی انفرادیت کے حوالے سے ''درد کے پھول'' کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''صفدر میر دورِ حاضر کے اس مکتب اظہار سے متعلق ہیں جس میں راشد اور میراجی ممتاز ہیں۔ اسلوب اور مزاج کے اعتبار سے ان کی ابتدائی نظمیں میراجی سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ راشد کی شاعری کا روزمرہ عجمی اور کلاسیکی ہے۔ میراجی کا ہندی کی عوامی اور صوفیانہ شاعری سے متاثر راشد کے مضامین زیادہ اجاگر ہیں اور ان کے اظہار میں ابہام وافر ہے۔ موسیقیت بہت کم اس

کے برعکس میراجی کے گیتوں اور نظموں کی فضا زیادہ دھندلی اور موہوم ہے اور یہی خصوصیت صفدر میر کی نظموں کی بھی ہے۔ تنہائی اور نارسائی کے مضامین بھی صفدر اور میراجی میں بہت زیادہ مشترک ہیں لیکن ان سب مشابہتوں کے باوجود، لغت استعاروں اور علامتوں کی ایجاد میں صفدر نے عجمی اور ہندی دونوں روایتوں سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کی ہے اور اظہار مطلب کے لیے مروجہ شاعرانہ ساز و سامان کا سہارا نہیں لیا۔ اظہار معنی کی تلاش میں ان کا رخ راشد اور میراجی دونوں سے جدا ہے ان کا طریق نہ غنائیہ ہے نہ بیانیہ بل کہ انھوں نے فکر اور جذبے کی جزئیات کو ہمیشہ مجرد تصاویر یا Images میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (۱)

صفدر میر کی علامتیں حال کی بے رنگی اور نا آسودگی کو پیش کرتی ہیں۔ نظم ''صدائے رہرواں'' کی علامتیں اسی نوعیت کی ہیں:

ریت اڑتی ہے کبھی تیز ہوا چلتی ہے
خارزاروں میں ہوا خشک درختوں میں ہوا
سُونے معبد میں ہوا
موت کے راگ دھندلکے میں بکھر جاتے ہیں
دور سے ماؤں کے نوحے کی صدا آتی ہے
یہاں پانی نہیں یہ سلسلۂ موج نہیں
ریت پر بن کے بگڑتی ہے ہوا کی تحریر
خُشک بادل کبھی کہساروں میں
خُشک چہرے سوئے گردوں نگراں
(خُشک بادل بھی گرجتے تو ہیں برسیں گے کبھی؟)
گونج کی لرزشیں بے آب چٹانوں میں رواں
گونج کی لرزشیں ہیں پانی کی آواز نہیں
یہاں پانی نہیں یہ سلسلۂ موج نہیں
ریت پر بن کے بگڑتی ہے ہوا کی تحریر
کبھی آئے گی یہاں دشت میں پانی کی صدا؟
کبھی آئے گی یہاں دشت میں پانی کی صدا؟
اے خدا اے مرے اجداد کے رب
اے مرے اجداد کے رب (۲)

یہاں 'پانی' مرکزی علامت ہے جو ناپید ہے۔ 'خشک بادل' قحط سالی کی رمز ہیں۔ 'بے آب چٹانیں' ویرانی کے تاثر کو

مزید گہرا کرتی ہیں۔ نظم میں ہر طرف ویرانی کا نقشہ نظر آتا ہے۔ شاعر انسانی زندگی میں احساس مرگ اور بے بسی کی شدت کو واضح کرتا ہے۔ 'پانی' اس کی ذات کا عکس بھی ہے جو لق و دق صحرا سے ناپید ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل اس سلسلے میں ''درد کے پھول'' کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> ''جب صدائے رہرواں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی تو بعض نقادوں نے اسے ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی (Waste Land) کا سرقہ قرار دیا تھا۔ یہ سرقہ ہو یا نہ ہو اس نظم پر (Waste Land) کا اثر بہت واضح ہے لیکن چوں کہ صفدر اپنے عکس کی تلاش میں سرگرداں تھا اور ہے وہ کسی اور فن کار کی محض عکاسی نہیں کر سکتا تھا اور اب بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے (Waste Land) میں پانی کی علامت کا ایک واضح مطلب نظر آتا ہے اور وہ نورخیزی اور تخلیقی فراوانی، لیکن صفدر کے ہاں پانی، کا مطلب ایک مبہم آئینہ ہے جس میں اسے اپنا عکس نظر آ سکے۔ اپنے درد کی شدت کی گونج سنائی دے سکے جب وہ پانی نہیں دیکھتا تو چلا اٹھتا ہے۔ پارہ پارہ اور ذرّہ ذرّہ ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ اس لق و دق صحرا میں اسے اپنا وجود نظر نہیں آتا۔'' (۳)

'پانی' ان کے ذاتی عکس کی شناخت کا وسیلہ ہے جس کے نہ ملنے پر وہ شکستگی اور اداسی محسوس کرتے ہیں۔ انیس ناگی ویسٹ لینڈ (Waste Land) اور صدائے رہرواں کے ایک بنیادی فرق کا اظہار اپنی کتاب ''نیا شعری افق'' میں کرتے ہیں:

> ''محمد صفدر اور ایلیٹ کے ویسٹ لینڈ میں نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ ایلیٹ کو اپنے عہد حاضر کی منفی زندگی میں مذہبی اور کلیسائی اقدار کا زوال نظر آتا ہے۔ اس لیے عرصہ حاضر اس کے لیے ایک ویرانہ ہے۔ اس کے برعکس محمد صفدر کو ویرانے اور شیون کا انداز غیر مذہبی ہے۔ اس نے انسانی مقدر کو موت، جنگ اور بے بسی کے حوالے سے دیکھا ہے۔'' (۴)

صفدر کی شاعری میں ایک لامتناہی کرب کی کیفیت ملتی ہے جو ان کے عہد کی سماجی و معاشی صورت حال کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ گردوپیش کے تضادات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تنہائی اور ناآسودگی انسان کی بے بسی اور انجام کو بہت کرب ناک بنا کر پیش کرتی ہے۔ جدید عہد میں انسان جس صورت حال سے دوچار ہے اور فرد جس انتشار کا شکار ہے اس کی ذات ریزہ ریزہ ہو کر کائنات میں بکھر جاتی ہے۔ نظم ''راہ کی دھول'' اس کی بھرپور عکاسی کرتی ہے:

دُھول ایسا رستوں میں بکھرا پھرتا ہوں
کہیں کسی تنگ و تاریک گلی میں کوئی
میرے پھیلے ہاتھ کے نقش سے گھبرا کر
لہراتے دامن کو تھامے چلتی ہے
کہیں کسی دہلیز سے اُبھری پیشانی پر

آتے جاتے پاؤں چھن بھر کو رُکتے ہیں
یا پھر اک خاموش آنگن میں
آپ سے آپ مرے قدموں کی آہٹ گونجنے لگتی ہے
اور کوئی کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہے
یا پھر رات گئے لٹکے تاروں میں اچانک
دل پر ہاتھ رکھے کوئی اُٹھ بیٹھتی ہے
رگ رگ میں میرے دل کی دھڑکن کو سننے لگتی ہے
لیکن آنکھیں پیاسی ہیں
اور دُھول ایسا رستوں میں بکھرا پھرتا ہوں (۵)

ناکامی اور ناآسودگی کے احساس نے فرد کو راستے کی دُھول بنا دیا ہے جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ تشنگی اور پیاس کی شدت میں دُھول کی طرح راہوں میں بکھرتے پھرنا فرد کی بے وقعتی کی علامت ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اپنی کتاب ''جدید اردو شاعری میں علامت نگاری'' میں لکھتے ہیں:

''راہ کی دُھول، منفی معاشرہ کی فرسٹریٹڈ ذات کی علامت ہے۔ ذاتی الجھنیں، نفسیاتی پیچیدگیاں، تصورِ حیات کی پریشاں حالی اور بے معنویت کے احساس نے فرد کو راہ کی دُھول بنا دیا ہے۔ 'راہ کی دھول' ایسے فرد کی علامت ہے جو سدا کی پیاسی خواہشات کا پشتارہ لیے پھر رہا ہے مگر سکون نہیں۔'' (۶)

صفدر میر کے ہاں طبقاتی کش مکش اور استحصال کے خلاف شدید ردِعمل ملتا ہے۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو علامتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ نظم ''یادیں'' ایسا ہی ردِعمل ہے جو طبقاتی کش مکش اور تضادات کے خلاف ہے۔ ''یادیں'' زندگی کی تلخیوں کا نشان بن گئی ہیں:

ویرانے میں یادیں ہیں کنول کی جھیلوں کی لہراتی یادیں
شام کی مدہم تاریکی میں
ہلکی ہلکی بارش کی دھندلی فریادیں
چکلے کے در و دیوار پہ اُگتے
سنولائے سنولائے پھُولوں ایسے چہرے
سستے سگریٹ اور مہنگی بیمار ہنسی کا دھواں اڑاتے
یادیں ہیں لاکھوں چہرے لاکھوں متحرک بازو
پاؤں جسم، مشینیں
دن کی پامالی رات کی پامالی راشن ڈپو

زرداروں کے محلوں، بنکوں فیکٹریوں کے سائے سائے
بھوتوں ایسے پھرتے نیند میں کھوئے کھوئے (۷)

زندگی کے یہ مسخ شدہ روپ شاعر کے دل کو اضطراب میں مبتلا کرتے ہیں تو مشینوں کی تہذیب سے مٹتی ہوئی قدریں دل میں اداسی بھر دیتی ہیں۔ جبر زدہ معاشرے سے فراریت کا رویہ بھی ابھرتا ہے۔ نظم ''کنارِ دریا'' میں جبر میں جکڑی انسانیت کا تصور ابھرتا ہے۔ ظلم و جبر کے اس ماحول سے دور وہ فطرت میں پناہ لیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے تھکے ماندے وجود کو سکون دینے کے لیے فطرت بہترین سہارا بن جاتی ہے۔ نظم ''کنارِ دریا'' کی علامتیں ملاحظہ ہوں:

شہر سے، وحشت کی زنجیروں سے دور
خواب سے نا آشنا سنگین دیواروں سے دور
جبر سے پابستہ انسانوں سے دور
چاند کے چاندی سے پھول
پرسکوں شاخوں کے نیچے خاک پر بکھرے ہوئے
اوس میں بھیگی صدائیں
جھینگروں کی نرم لہروں کی صدائیں
سبز خواب آلود پتوں پر حریری جال پھیلاتی ہوتی
کیوں تھکن سے چور بازو پھر سے پھیلا کر اڑوں؟
کیوں نہ سب کچھ بھول کر
گرم پیشانی کو ٹھنڈی ریت پر رکھے ہوئے
سو رہوں سوتا رہوں (۸)

اس نظم میں 'شہر' جبر کی علامت ہے جہاں وحشت نے ڈیرے ڈالے ہیں جس کی سنگین دیواریں خوابوں کی لطافت سے نا آشنا ہیں۔ انسان جبر کا شکار ہے۔ ان حالات میں شاعر فطرت سے ہم آہنگ ہو جانا چاہتا ہے۔ 'چاند' رومان کی علامت ہے جس کے تحت جبر زدہ اس معاشرے سے دور ایک بستی بسانے کی خواہش حساس شاعر کے دل میں ابھرتی ہے۔ تندو تیز طوفانوں اور سنگ خارا کی سیاہ تپتی چٹانوں سے دور نرم ریت پر پیشانی رکھ کے سونے کی خواہش تہذیبی وتمدنی اقدار کی شکست و ریخت اور صنعتی معاشرے کے جبر کی وجہ سے سر اٹھاتی ہے۔ انسان کا خود کو شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرنا صفدر میر کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں فرد کا دم گھٹ رہے، انھیں اپنے گردوپیش میں محسوس ہوتی ہے۔ نظم ''کشتیاں'' میں سمندر، کشتی اور مشقت انسانی زندگی میں محنت کوشش اور اس کے انجام کا استعارہ ہے۔ 'کشتی' کا تعلق بہاؤ سے ہے جو دراصل زندگی کے بہاؤ کی علامت ہے۔ زندگی کے بے پایاں سمندر میں کشتی کا چلانا محنت طلب ہے مگر یہ ساری محنت استحصالی قوتوں کی بدولت اکارت چلی جاتی ہے:

یہاں سینکڑوں سال سے

کہکشاں کے ستاروں
کی مانند موجوں پہ بکھری ہوئی
کشتیاں بال کھولے
گزرتی رہی ہیں
گرجتے دھارے کو چیرتی کشتیوں کے کڑیل چلانے والوں
کے بازوؤں میں وہی تھکن بھرا سکوں ہے
جو تیز دریا کی مست گھمبیر چال میں ہے
تنے ہوئے چرچراتے رسّے
لرزتے اعصاب تند سانسیں
جُھکے ہوئے جسم کانپتے تھرتھراتے بازو
یہی خموشی یہی مشقت
سدا خموشی سدا مشقت
سدا سہاگن زمیں کے بیٹوں کی آج تک ہے یہی کہانی
یہی ہے قسمت
یہی رہے گی سدا رہے گی (۹)

صفدر میر اپنے عہد کے آشوب کو باطنی محسوسات میں سمو دیتے ہیں اور ان کا اظہار زیادہ تر فطرت کے استعاراتی حوالوں سے ہم آہنگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ چناں چہ نظم ''بیمار لڑکی'' میں فطرت کے پس منظر میں ایک تھکی ماندی ذات کے داخل اور خارج کے ٹکراؤ کو اس رنگ میں پیش کیا گیا ہے:

خزاں کے رنگوں میں بے بسی ہے
خزاں کے گیتوں میں بے بسی ہے
خموش بستی کے پار جنگل میں بے بسی ہے
یہاں دریچے میں میرے پہلو میں بے بسی ہے (۱۰)

وہ توجہ دلاتے ہیں کہ انسان جکڑ بندیوں کا اسیر ہے۔ سیاست، سماج، معاش اور جذبہ و جدائی کی دنیا کا ٹکراؤ جاری ہے۔ بے بسی کے ماحول میں اس کا دم گھٹ کر رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود زندگی کا دریا بڑے بہاؤ کے ساتھ چلتا چلا جاتا ہے، رکتا نہیں، لکھتے ہیں:

رات بھر برف خموشی سے گری گرتی رہی
رات بھر برف ڈھلانوں پہ درختوں پہ گری گرتی رہی
صبح سے پہلے سکوں

نیلگوں نور میں ملبوس اٹھا
تیرگی پھر سے امنڈ آئی ہے
ندی برف کی چرچراتی سلوں کے تلے
ہانپتی جا رہی ہے
نگہ سے درختوں کے یخ بستہ پیراہنوں کو چھوؤ
نمی کو سرکتے جڑوں میں اُبھرتے سنو
مگر میری مردہ رگوں میں ابھی تک اندھیرا ہے
اعصاب سے سرد کہرا
لپٹتے ہوئے کہتے جاتا ہے ''خاموش خاموش سوتی رہو
کبھی شام آئے گی خاموش خاموش سوتی رہو
چھلکتی ہوئی چاندنی ساتھ لے کر
ابھی شام آئے خاموش خاموش سوتی رہو
تمھیں اوس کا روپ دے کر فضا میں اڑائے گی سوتی رہو
تمھاری چمکتی ہوئی ہڈیاں بیتی خوشیوں کو لپٹائے
چپکی پڑی سوچتی جائیں گی چاندنی میں سلگتی رہیں گی (۱۱)

انسانی زندگی میں بے بسی کے اندھیرے چھائے ہیں۔ وہ ان اندھیروں کو اور اس کے انجام کو موت کے تصور سے وابستہ کر کے دیکھتے ہیں۔ نظم ''شہرِخموشاں'' میں جب وہ 'شہرِخموشاں' کے مزاروں پر سرگوشیاں کرتی ہواؤں کو دیکھتے ہیں تو انھیں زندگی کی بے معنویت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ''شہرِخموشاں'' کو دیکھ کر جہاں ہر طرف موت کے سائے لرزتے ہیں، ان کے دل میں ان کے اپنے ہنستے بستے شہر کے لوگوں کی زندگی اور اس کی بے معنویت کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ اندھیرے کا یہ تصور دکھ کے احساس کو عمیق کر دیتا ہے:

اندھیرا جاگ اٹھا ہے
مزاروں پر ہوا سرگوشیاں کرتی گزرتی ہے
یہ ان کا شہر جو تھے، نہیں ہیں
مکانوں پر ہوا سرگوشیاں کرتی گزرتی ہے
یہ اُن کا شہر ہے جو ہیں نہیں تھے (۱۲)

ماضی کے ذکر کے ساتھ شاعر حال کا تذکرہ کرتے ہوئے حال کی بدحالی بیان کرنا چاہتا ہے۔ گویا وہ لوگ جو کبھی تھے، اب ماضی کا نشان بن چکے ہیں۔ تاروں کی حسیں آنکھوں نے انھیں دیکھا تھا مگر اب ان کی خاک بھی غبار راہ بن کے اڑ چکی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اب شہرِخموشاں میں آباد ہیں۔ ان کے شکستہ سر اندھیرے میں چمکتے ہیں۔ دراصل

یہ لوگ نشان عبرت ہیں جو کبھی تھے مگر اب ان کا وجود نہیں ہے۔ ماضی کے اندھیروں سے صفدر میر حال کے اندھیروں میں بدحالی کے نقشوں کو دیکھ کر دکھی ہوتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ماضی میں نہیں تھے مگر حال میں ہیں مگر ان کی زندگی میں ہر طرف اندھیرے چھائے ہوئے ہیں:

یہ کیسی زندگی ہے یاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
اندھیرا دن بھی ہے رات میں بھی ہے
اندھیرا ہی اندھیرا ہے (۱۳)

نظم ''اندھا'' میں احساس ناکامی اور اس سے پیدا ہونے والی لامتناہی تنہائی کو علامتی انداز میں یوں پیش کیا گیا ہے:

دن کے اندھیرے میں دھیمی سہلانے والی
آوازیں ہیں
چمکیلے چمکیلے خواب دکھانے والی
پروازیں ہیں
ان آوازوں، ان خوابوں سے
تنہائی بے خواب پروں کو سمٹاتی ہے
شام خموشی لے آتی ہے
رات کے بے آواز اندھیرے کی دل کو دہلانے والی
اونچی اونچی دیواروں سے
اپنی ہی آواز کبھی ٹکرا جاتی ہے
تنہائی پر پھیلاتی ہے (۱۴)

زندگی میں ناکامی کا احساس تنہائی کو گہرا کرتا چلا جاتا ہے۔ ایسا سماج جہاں خواہشات پر پہرے لگا دیے جاتے ہیں۔ تنہائی کی دیواریں بلند سے بلندتر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی قسم کے تمدنی اور معاشرتی انتشار کو نظم ''تم اور میں'' میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں تم اور میں کی جدائی اسی تمدنی انتشار کی علامت ہے:

تم اور میں اور یہ دیواریں
دُھول سے بوجھل
دھک دھک کرتے
زنگ آلود چراغوں کی کالونچ میں سنتے
کانپ کانپ اٹھے ہوئے جالوں کے پیچھے
پیلے چہروں والی لاشوں کے تھراتے کانپتے نقش

اور تم
اور میں
اور یہ دیواریں (۱۵)

زندگی کے اندھیروں معاشرتی جبر کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نظر نہیں آتے بل کہ یخ آلود موج ہوا میں چھلکتا ہوا رس امید اور زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔ نظم ''زندگی'' میں یہ رنگ یوں نظر آتا ہے:

ابھی دل ہری پتیوں کونپلوں
نرم کلیوں سے خالی ہے ویران ہے
مگر مردہ مٹی کو پھر زندگی دینے والے کا احسان ہے
کہ اب کے برس بھی
چھلکتا ہوا رس رگوں میں ابھرنے لگا ہے (۱۶)

نظم ''راکھ کا ڈھیر'' کا موضوع زوال ہے جس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ ان کے مطابق یہ المیہ ہر عروج کے ساتھ جڑا ہے۔ نظم ''شام'' میں 'ہوا' کی علامت سامنے آتی ہے۔ 'ہوا' تخریب اور خوف کا نشان ہے جو تلوار کی مانند چلتی ہے تو اس کا وجود سرتاپا خوف اور دہشت کی علامت بن جاتا ہے:

درختوں سے نکل کر رینگتی پر چھائیں دریا کی جانب بڑھتی آتی ہیں
فضا میں ان گنت موجوں کے دل کی دھڑکنیں اک ساتھ اٹھتی ہیں
درختوں میں، کنول کی بستیوں میں ریگ دریا میں
ہوا، عریاں ہوا تلوار کی مانند چلتی ہے (۱۷)

ہوا کے اس خوف ناک روپ کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں ہوا سرخوشی کشید کرنے کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید مضمون ''جدید اردو نظم کے علامتی پیکر ''ہوا'' میں لکھتے ہیں:

''ہوا ان کے ہاں محض تخریب کی علامت ہی نہیں بل کہ یہ ہمہ رنگ و نغمہ ماضی کی طرف مراجعت کی علامت بھی ہے۔'' (۱۸)

چناں چہ نظم ''ہوائیں'' میں 'ہوا' کی علامت کے ذریعے ماضی کی طرف مراجعت کا اظہار اس طرح ہوا ہے:

ان راہوں پر دریا کی بل کھاتی دھارا
بکھری بکھری خواہش سے بھری آوازوں میں
ایک الجھا سا ناکام افسانہ کہے جاتی تھی
دامن میں کبھی انجانے پھولوں کی کرنیں
اور کبھی دل کے محرم مرجھائے ہوئے فریادی پتے
لیے ہوئے ساگر کی طرف دھیرے دھیرے

بے بس مجبور بہے جاتی تھی
لیکن اب یہ کون ہوائیں چھیڑ رہی ہیں پانی کو؟
کس دیس کی مٹی کی خوشبو
کن ہونٹوں کی مدھم گن گن
کس آنچل کے کن بالوں کے
بادل ایسے بوجھل سائے
کن آنکھوں کی خاموش چبھن،
کن ہری بھری بانہوں کی تھکن
لائی ہیں ہوائیں چھیڑ رہی ہیں پانی کو
طوفان ایسی چھائی ہیں ہوائیں چھیڑ رہی ہیں پانی کو (۱۹)

لاشعور میں یادوں کے چراغ جلتے ہیں تو ہوائیں ان یادوں کو شبنمی حدت عطا کرتی ہیں۔ یوں ہوائیں ماضی کی طرف مراجعت کی علامت بن جاتی ہیں۔صفدر میر کے ہاں ماضی اور اس کی بازگشت کے ساتھ حال اور مستقبل کے سنہرے خواب بھی ملتے ہیں۔منظوم ڈراما ''جنگل'' میں ماضی، حال اور مستقبل کو علامتی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔''جنگل'' جدید صنعتی عہد میں ابھرتے ہوئے تہذیبی احساس کی علامت ہے جس کے ذریعے رشتوں ناتوں، رسموں اور رواجوں اور جذبات و احساسات کی شکست و ریخت کو بھرپور انداز سے بیان کیا گیا ہے۔''جنگل'' جس میں قدم قدم پر دشواریاں ہیں۔'شاہد' نئی نسل کی علامت ہے۔ والدین ماضی کی علامت ہیں۔ ماضی اپنے مکمل زوال کے ساتھ حال کے روبرو ہے اور اس زوال کا باعث مشینی تمدن ہے۔شاہد حال کی علامت ہے جو محض تماشائی ہے:

شاہد میں شاہد ہوں
جو کچھ میں نے فقط دیکھا ہے
میرا عمل کیسے کہلائے گا
میرا کوئی جرم نہیں ہے
میرا کوئی عمل نہیں ہے
اپنی ساری زندگی میں
میں نے کسی عمل میں
کبھی کوئی بھی حصہ لیا ہو؟
کبھی نہیں
میں محض دیکھنے والا ہوں
شاہد ہوں فقط

صرف تماشائی ہوں میں
ہر ایک قدم پر میں اقدام سے بھاگا ہوں
ہر لحظہ دور کھڑا رہتا تھا
دیکھتا تھا چپ رہتا تھا
کتنی بے درد ہے وہ قوت
جس نے میرا یہ مقسوم بنایا ہے دیکھوں
اور دور کھڑا خاموش رہوں
درد سے رستے چھالوں ایسی آنکھوں سے
میں نے دیکھا
چاروں جانب اک مقتل ہے
نفرت کی دلدل میں کوئی
گھٹنوں گھٹنوں پھنسا ہوا
سورج مکھی کے پھول اُگانے پر مائل ہے
(چڑیلوں کی ہنسی) (۲۰)

زیست کے اس جنگل میں والدین ماضی کی علامت ہیں۔نئی نسل پرانی نسل کو ختم کرتی ہے۔ ماضی قدرت کی علامت ہے اور 'شاہد' کا باپ ماضی کی علامت ہے جسے وہ قتل کر دیتا ہے:

میں نے اپنے باپ کو دیکھا
آنکھوں میں
شیروں ایسی جوالا جلتی تھی
اعصاب میں بجلی کے کوندے تھے
آواز میں بادل پنہاں تھے
پھر وہ آگ وہ بجلی، بادل
بستر کی چادر پہ پڑی سگریٹ کی راکھ تھی کچھ بھی نہ تھا
(چیخ کر) میں نے دیکھا تھا
کچھ بھی نہ تھا
میں اپنے وطن میں تھا اور پھر بھی جلاوطن تھا
اور میرا باپ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے خاموشی سے
اک کونے میں گھر کے قطرہ قطرہ ہو کے

جیسے خون کے قطرے کیچڑ میں گرتے ہیں موت سے متعارف ہوتا ہے
اور میں دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں
پھر میں نے اس کو قتل کیا (۲۱)

باپ کا قتل دراصل ماضی کا خاتمہ ہے اور ''سگریٹ کی راکھ'' ماضی کے ختم ہونے کی علامت ہے۔شہروں ایسی جوالہ، بجلی کے کوندے، آواز میں بدل پنہاں ہونا ماضی کے شان دار ہونے کی دلیل ہے مگر اس کا انجام راکھ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مجموعی طور پر صفدر میر کی علامتیں شکست و ریخت کا اظہار ہیں جس میں نارسائی اور تنہائی کا کرب جھلکتا ہے۔ ان کی علامتوں میں اجتماعی لاشعور، حال کا مشاہدہ اور طبقاتی احساس کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل اور طرز فکر کو موثر انداز سے پیش کیا ہے۔

حوالے:

۱۔ فیض احمد فیض: (فلیپ) درد کے پھول، لاہور: العظمت کینال بینک،۱۹۶۴ء
۲۔ محمد صفدر، میر: درد کے پھول، ایضاً،ص:۱۴
۳۔ محمد اجمل، ڈاکٹر: ایضاً،ص:۳
۴۔ انیس ناگی: نیا شعری افق، لاہور: جمالیات، ۱۹۸۸ء،ص:۷۵
۵۔ محمد صفدر، میر: درد کے پھول، ایضاً،ص:۷۶
۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر: جدید اردو شاعری میں علامت نگاری،ص:۲۶۰
۷۔ محمد صفدر میر: درد کے پھول، ایضاً،ص:۶۳
۸۔ ایضاً،ص:۲۲
۹۔ //،ص:۳۹
۱۰۔ //،ص:۴۵
۱۱۔ //،ص:۵۰
۱۲۔ //،ص:۱۷
۱۳۔ //،ص:۱۸
۱۴۔ //،ص:۳۵
۱۵۔ //،ص:۷۳
۱۶۔ //،ص:۷۹

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۹

۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر: مضمون ''جدید اردو نظم کے علامتی پیکر ہوا'' مشمولہ اوراق (جدید نظم نمبر)، ص: ۱۷۹

۱۹۔ محمد صفدر میر: درد کے پھول، ص: ۵۹

۲۰۔ ایضاً، ص: ۱۱۸

۲۱۔ //، ص: ۱۲۰